اسلام کا تعارف

مولانا وحید الدّین خاں

اسلام کا تعارف

مولانا وحید الدین خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آریہ سماج (سیوہارہ ضلع بجنور) نے اپنے چونسٹھ سالہ جشن جوبلی کے موقع پر آخری نومبر ۱۹۵۹ء میں ایک ہفتہ منایا۔ اس موقع پر ۲۹ رنومبر کو عام قسم کی مذہبی کانفرنس بھی ہوئی جس میں مختلف مذاہب کے علماء نے شریک ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مقالہ اسی آخری نشست میں پڑھا گیا۔

اس کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق و مالک ہے۔ خدا نے ایک خاص اسکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے جن کو ہم رسول کہتے ہیں۔ حضرت محمدؐ اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپؐ کی پیروی کرنی ہے۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پائے اور پھر اس کو قبول نہ کرے وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کرتا ہے۔ ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں بلکہ اس کا باغی ہے اور خدا کی رحمتوں میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ مختصر طور پر اسلام کا تعارف ہے جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے۔

خدا کا وجود

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود میں آگیا ہے اور اپنے آپ چلا جارہا ہے۔ ہکسلے کے الفاظ ہیں ـــــ

چھ بندر ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحہ پر شکسپیر کی

ایک نظم نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے۔

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ دراصل کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے، کیوں کہ اتفاق یا حادثہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر جو چیز خود اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی۔ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے۔ کائنات اتنی پُر حکمت اور اتنی منظّم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آ گئی ہو۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لئے جو حالات ضروری ہیں وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں پالے کی نذر ہو جاتیں۔ سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلہ پر ہے کہ یہ "دائمی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دگنے فاصلہ پر چلا جائے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہوگی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آ جائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہوگی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے۔ بلکہ ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف کو جھکا ہو

ہے۔ یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ صرف ایک لاکھ میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دوبار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے۔ یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں۔ ان کے سوا بے شمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں ہوسکتا اور نہ محض اتفاق انھیں باقی رکھ سکتا ہے۔ یقیناً کوئی ہے جو ان واقعات کو وجود میں لایا ہے اور ان کو اس قدر منظّم طریقہ پر مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ کائنات اتنی مربوط اور منظّم ہے کہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو در حقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں۔ کائنات کے ایک ایک جزو کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اس کو ایک کمتر درجہ کی چیز بنا کر پیش کر رہے ہیں، ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلاف عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلاف عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کرلیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ مگر یہ ایک سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا۔ خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں۔ یا خدا کو بے سبب مانیں یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر یا تو ہم یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی ہستی اور ہے جس نے اس کو بنایا ہے۔ دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے تو پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے، جب کہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلے کے ارد

گرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سب کچھ ہمارا واہمہ ہے۔ مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق

خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اس کی تردید کر دی ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جا رہی ہے۔ اس نظریہ پر سائنس دانوں کو اس قدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر مارکس پلانک (Max Planck) نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں اور اس کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر اس نظریہ کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کر کے جدید کوانٹم نظریہ (quantum theory) کی صورت میں آج علم طبیعت کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔[1]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگ کے ذریعہ حرکت کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں آئین سٹائین نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل (discontinuity) ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے، یہ اصولِ تعلیل کو اس کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۲۔۲۰

بلند مقام سے معزول کر رہا ہے جو اس سے پہلے عالم فطرت کے تمام واقعات کا رہنما سمجھا جاتا تھا۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے۔ جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معین ہو چکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سبب اول کے طور پر اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکت اول کے لئے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی بلکہ وہ ہر آن حرکت دیئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چالو مشین نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جارہا ہے۔ ایک حی و قیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہو جائے گی جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردۂ سینمیں کے واقعات غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ گویا اس دنیا کا ہر ذرہ اپنے وجود اور حرکت کے لئے ہر آن قادر مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے، جو ہمارے لئے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے۔ جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ ہم اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کریں اور اسی کے بندے بن جائیں۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے۔ محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے۔ محسن کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اس کی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں۔ ہم کو جو کچھ ملے گا اسی سے ملے گا۔ اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے، یہ ہندستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے۔ ہم نے یا خدا نے۔ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں، بالکل پانی نہ برساتیں اور سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی ہندستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے اور زمین ایک مرکز گریز قوت کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے اور اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے۔ اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ اتھاہ خلا کے اندر ایک آگ کا گولہ بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی لاکھ میل تک فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے۔ پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچاس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا

نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا ہے۔ اس بے انتہاء وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ایک ذرہ سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کے مانند اس ذرہ سے چمٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے۔ غور کیجئے، انسان کس درجہ حقیر ہے اور خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر ہماری حیثیت جب یہ ہے تو ہم خالق کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک بچے کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی، اس کی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے۔ وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہئے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے۔ خدا کی طرف سے انسان کی یہی حیثیت قرار پائی ہے اور خود انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔

معرفت کا حصول

یہاں پہنچ کر جب ہم گرد و پیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جا رہی ہے۔ ایک معمولی بھڑ کی مثال لیجئے۔ بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڈھا کھودتی ہے اور ایک ٹڈے کو قابو میں کر کے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنک

مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے[1]۔ بھڑ اب اس بے ہوش ٹڈے کے ارد گرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیوں کہ مردہ گوشت ان بچوں کے لئے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر کبھی آکر اپنے بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے۔ ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک انجام دیتی ہیں۔ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو باقی رکھنے کے لئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

دوسری مثال اس لمبی مچھلی کی ہے جسے انگریزی میں ایل (Ell) کہتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل کر جزیرۂ کرموڈہ کی طرف سمندر کی ایک گہری تہہ میں جاتے ہیں۔ یورپ کی ایلین اٹلانٹک میں تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دے کر مر جاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انہی کناروں پر آلگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ والی ندیوں، جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلین ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔

آمد و رفت کی یہ معلومات انھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟۔ یہ کام ''وحی'' کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی، پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔

---

[1] اسی حیرت انگیز عمل کو دیکھ کر فلسفی برگسان نے کہا تھا ''کیا بھڑ نے کسی مدرسے میں ماہر عضویات سے تعلیم حاصل کی ہے''۔

کوئی مخلوق زندگی گزارنے کے لئے کیا کرے اور خالق کائنات نے اپنی مجموعی اسکیم کے اندر اس کے ذمہ جو فرض عائد کیا ہے اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے۔ اور دوسری وہ جس کا تعلق انسان سے ہے۔ انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہیں۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے۔ جس کو ہم جبلت کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جانداروں کے لئے ترک و اختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت و عادت فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنادی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دہراتے رہیں۔

مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کام کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے۔ اور ایک کام کو نہیں کرتا اور بعد کو اس کو کرنے لگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگر چہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جس طرح اس کی دوسری مخلوقات، مگر اس کو حالت امتحان میں رکھا گیا ہے۔ جو کام دوسری مخلوقات سے عادت فطری کے تحت لیا جا رہا ہے انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام حیوانات کی وحی ان کی فطرت میں پیوست کر دی گئی ہے اور انسان کی وحی خارج سے اسے پہنچائی جاتی ہے۔ عام حیوانات کو کیا کرنا ہے، اس کا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان جب عقل و ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کی طرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے۔ جو شخص یہ پیغام لے کر آتا ہے اس کو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے

ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اس کے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے۔ اس طرح وہ شخص براہ راست خدا سے اس کی مرضی کا علم حاصل کر کے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے۔

وحی کا مسئلہ

اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کسی بندۂ خاص پر خدا کی وحی کس طرح آتی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانہ میں وہ کون سی وحی ہے جس سے ہمیں خدا کی مرضی کا علم حاصل ہوگا۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ انسان نے جو مشینیں اور آلات بنائے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لوہے کے ہیں۔ اگر لوہے کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوگی کہ انسان نے اس کو کس طرح دریافت کیا جب کہ انسان کو لوہے کے متعلق پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے کس طرح ذرّات کو یکجا کیا جو مختلف مرکبات کی شکل میں زمین کی مختلف چٹانوں کے ساتھ مخلوط ہو کر منتشر پڑے تھے۔ پھر انھیں خالص لوہے کی ٹھوس شکل میں تبدیل کیا۔ یہی حال دوسری ایجادات کا بھی ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان ایجادات کی طرف انسانی ذہن کی رہنمائی کس طرح ہوئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو تجربہ اور مشاہدہ کے دوران میں ایک سائنس داں کو اس مخصوص نکتے تک پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچ کر اسے ایک مفید اور کارآمد نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو بات ہم کو معلوم نہیں تھی وہ ہم کو کیسے معلوم ہوگئی۔ اس علم کا ذریعہ وہی خدائی فیضان ہے جس کو ہم وحی کہتے ہیں۔ سب کچھ جاننے والا اپنے علم میں سے تھوڑا سا حصہ اس کو عطا کر دیتا ہے جو کچھ نہیں جانتا۔ یہ فیضان وحی کا ابتدائی درجہ ہے جو غیر محسوس طور پر آتا ہے اور ہر شخص کو اس میں حصہ ملتا ہے۔ وحی کی دوسری قسم زیادہ ترقی یافتہ ہے جو شعوری طور پر آتی ہے اور صرف ان لوگوں کے پاس آتی ہے جن کو رسالت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو۔ انسان کے پاس حقیقت کا علم اور دنیا میں زندگی گذارنے کا طریقہ اسی دوسری قسم کی وحی کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔

وحی کی حقیقت کو ہم بس اس قدر سمجھ سکتے ہیں، اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا دراصل ایک ایسا مطالبہ کرنا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔ ایک اڑتے ہوئے جہاز کو زمین سے لاسلکی پیغام بھیجا

جاتا ہے جس کو ہوائی جہاز پر بیٹھا ہوا آدمی پورے یقین کے ساتھ صاف الفاظ میں سن لیتا ہے۔ یہ ہماری قریبی زندگی کا ایک واقعہ ہے، مگر آج تک اس کی مکمل توجیہہ نہیں ہوسکی کہ یہ واقعہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جن سے ہم اس زمین پر واقف ہیں۔ ہم تمام حقیقتوں کو صرف مجمل طور پر جانتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کسی حقیقت کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلی واقفیت ہمارے بس سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں وحی کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھنے کا مطالبہ کرنا کسی ایسے ہی آدمی کا کام ہوسکتا ہے جو خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو۔

سائنس نے اب یہ تسلیم کرلیا ہے کہ حقیقت مطلق کا علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلہ میں، میں پروفیسر ہائزن برگ (Heisen Berg) کی دریافت کا حوالہ دوں گا جس کو وہ اصول عدم تعین (princeple of indeterminary) کا نام دیتا ہے۔ جیمز جینز اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''قدیم سائنس کا خیال تھا کہ کسی ذرّے مثلاً ایک الکٹران کا مقام مکمل طور پر بتایا جاسکتا ہے جب کہ ہم یہ جان لیں کہ کسی وقت میں فضا کے اندر اس کا مقام اور اس کی رفتار کیا ہے۔ اگر ان معلومات کے ساتھ بیرونی اثر انداز طاقتوں کا بھی علم ہو جائے تو الکٹران کے تمام مستقبل کو معین کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر کائنات کے تمام ذرّوں کے متعلق ان باتوں کا علم ہوجاتا ہے تو ساری کائنات کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کی جاسکتی تھی۔ مگر ہائزن برگ کی تشریح کے مطابق، جدید سائنس اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان مقامات کی دریافت میں تو قوانین قدرت حائل ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ ایک الکٹران فضا میں کسی خاص مقام پر ہے جب بھی ہم ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ قدرت کسی حد تک گنجائش سہو (margin of error) کی اجازت دیتی ہے، لیکن اگر ہم اس گنجائش میں گھسنا چاہیں تو قدرت ہماری کوئی مدد نہیں

کرتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بالکل صحیح پیمائشوں سے قطعاً نا آشنا ہے۔ اسی طرح اگر ہمیں کسی الکٹران کی حرکت کی ٹھیک ٹھیک رفتار معلوم ہو تو قدرت ہمیں فضا کے اندر اس کا صحیح مقام دریافت کرنے نہیں دیتی۔ گویا الکٹران کا مقام اور اس کی حرکت کسی لالٹین کے سلائڈ کی دو مختلف سمتوں پر نقش ہیں۔ اگر ہم سلائڈ کو کسی خراب لالٹین میں رکھیں تو ہم دو رخوں کے درمیان نصف کو روشنی میں لا سکتے ہیں اور الکٹران کے مقام اور اس کی حرکت دونوں کو کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھی لالٹین کے ذریعہ ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہم ایک پر جتنی زیادہ روشنی ڈالیں گے دوسرا اتنا ہی دھندلا ہوتا چلا جائے گا۔ خراب لالٹین قدیم سائنس ہے جس نے ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ اگر ہمارے پاس بالکل مکمل لالٹین ہو تو ہم کسی خاص وقت پر ذرّے کے مقام اور اس کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکتے ہیں۔ یہی دھوکا تھا کہ جس نے سائنس کی جبریت (determinism) کو داخل کر دیا، مگر اب جب کہ جدید سائنس کے پاس زیادہ بہتر لالٹین ہے، اس نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ حالت و حرکت کی تعیین حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں جنہیں ہم بیک وقت روشنی میں نہیں لا سکتے۔[1]

اس سلسلے میں آخری سوال یہ ہے کہ خدا کی وحی جو مختلف زمانوں میں انسانوں کے پاس آتی رہتی ہے ان میں سے کون سی وحی ہے جس کا آج کے انسانوں کو اتباع کرنا ہے۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ بعد کے لوگوں کے لئے وہی وحی قابل اتباع ہو سکتی ہے جو سب کے بعد آئی ہو۔ حکومت ایک ملک میں کسی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص کی سفارت اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک وہ اپنے اس عہدے پر باقی ہو۔ جب اس کی مدت کارکردگی ختم ہو جائے اور دوسرے شخص کو اس عہدے پر مامور کر دیا جائے تو اس کے بعد وہی شخص حکومت کا نمائندہ ہو گا جس کو سب سے آخر میں نمائندگی کا موقع دیا گیا ہے۔

---

[1] ماڈرن سائنٹفک تھاٹ صفحہ ۱۷-۱۸

اس اعتبار سے حضرت محمد ﷺ ہی وہ آخری رسول ہیں جو آج اور آئندہ قیامت تک کے لئے انسانیت کے رہنما ہیں، جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اٹھے تھے، جن کے بعد نہ کوئی نبی ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ آپ کا تمام نبیوں کے بعد تشریف لانا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ آپ کو اور صرف آپ کو حال اور مستقبل کے لئے خدا کا نمائندہ قرار دیا جائے کیوں کہ بعد کو آنے والا اپنے سے پہلے آنے والوں کو منسوخ کرسکتا ہے مگر پہلے آنے والا اپنے بعد آنے والے کو منسوخ نہیں کرسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے پرانی اور ابتدائی مذہبی کتاب رگ وید ہو جو خدا کی ہدایت کے تحت مرتب کی گئی ہو۔ جیسا کہ انجیل نسبتاً درمیانی زمانے کی الہامی کتاب ہے۔ مگر اب یہ تمام کتابیں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے مضامین کی صحت مشکوک ہے اور اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنے کو آخری اور دائمی کتاب کی حیثیت سے پیش نہیں کرتی۔ صرف یہ واقعہ کہ وہ خدا کے آخری ہدایت نامہ سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان کو آج کے لئے منسوخ قرار دے دیتا ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول ہی کیوں تسلیم کریں۔ میرا جواب یہ ہے کہ جن وجوہ سے آپ دوسرے رسولوں کو مانتے ہیں انہی وجوہ سے آخری رسول کو بھی ماننا پڑے گا۔ آپ کسی دوسرے رسول کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ خدا کی طرف سے آئے تھے جو اصول بنائیں گے اور جو مقدمات بھی قائم کریں گے، ٹھیک انہی دلائل اور انہی مقدمات کی بنا پر آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول ماننا ہوگا۔ اگر آپ آخری رسول کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو سارے رسولوں کا انکار کرنا پڑے گا۔ اور اگر دوسرے رسولوں کو مانتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آخری رسول کو بھی تسلیم کریں اور جوں ہی آپ آخری رسول کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسی کو آخری سند قرار دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا اور آپ کو آخری سند تسلیم نہ کرنا دونوں بالکل متضاد چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ خدا کے آخری حکم کی موجودگی میں اس کے سابقہ حکموں کا حوالہ دینا خدا کی اطاعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ یہ خود اپنے نفس کی اطاعت ہے، نہ کہ خدا کی اطاعت۔

اسلام کا مختصر تعارف

اب میں مختصر طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ پیغام کیا ہے جس کو حضرت محمدؐ نے ہم کو اور ہماری آئندہ نسلوں کو دیا ہے۔ اس پیغام کو چار عنوانات کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ خدا کا صحیح تصور۔

۲۔ انسان کی پیدائش کا صحیح مقصد اور کائنات کے ساتھ اس کا تعلق۔

۳۔ انسان خدا سے تعلق جوڑنے کے لئے کیا کرے۔

۴۔ انفرادی اخلاق اور اجتماعی قانون کیا ہو۔

سب سے پہلی چیز جو رسول نے ہم کو بتائی وہ یہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ یہ خدا ایک ہے، کوئی کسی حیثیت سے بھی اس کا شریک نہیں۔ وہ سب کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور وہی ہے جو سارے واقعات کو وجود میں لا رہا ہے۔ اس حقیقت کی کسی قدر تفصیل اوپر آچکی ہے۔ یہاں میں قرآن کی ایک آیت نقل کروں گا جو اسلامی نقطۂ نظر سے خدا کے تصور کو مجمل مگر نہایت مکمل طریقے سے پیش کرتی ہے۔

الله لا اله الا هو الحی القیوم ○ لاتاخذه سنة ولا نوم ط له مافی السموات وما فی الارض ط من ذاالذی یشفع عنده الا باذنه ط یعلم مابین ایدیهم وما خلفهم ج ولا یحیطون بشیء من علمه الا بما شاء ج وسع کرسیه السموات والارض ج ولا یؤوده حفظهما ج وهو العلی العظیم○

اللہ وہ زندہ خدا جو کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اس کو نہ اونگھ لگتی اور نہ اسے نیند آتی۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر بولنے کی جرأت کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ بندوں کے پیچھے ہے اس کے علم میں جو کچھ ہے اس میں سے کچھ بھی کوئی حاصل نہیں کر سکتا، الا یہ کہ وہ خود ہی کسی کو کچھ دے دے۔ اس کی حکومت سارے عالم پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی نگرانی اس کے لئے تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔" بقرہ۔ ۲۵۵۔

دوسری چیز جو خدا کے رسول نے ہم کو بتائی وہ انسان کی پیدائش کا مقصد اور کائنات کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ اس نے بتایا کہ انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تا کہ اسے آزمایا جائے۔ انسان کو عمل کی آزادی دے کر اس کے پاس اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی بھیج دی ہے۔ اب وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے مالک کی مرضی کے مطابق چلتا ہے اور کون اس کے خلاف عمل کرتا ہے۔ کائنات کے ساتھ ساتھ انسان کا جو تعلق ہے وہ بھی اسی مقصد کے تحت ہے۔ یہ کائنات کسی شخص یا قوم کی جائداد نہیں ہے، نہ وہ کوئی الل ٹپ جگہ ہے بلکہ وہ اس لئے ہے کہ انسان کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں مدد دے۔ یہ دنیا دراصل ہمارا وہ میدان عمل ہے جہاں رہ کر ہمیں امتحان دینا ہے، اس کے سوا دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمارے اس امتحان کی ایک مدت ہے۔ ایک شخص کی مدت اس کی عمر تک ہے اور ساری انسانیت کی مدت اس وقت تک ہے جب تک انسانی پیدائش کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کے بعد کائنات کا مالک سب کو جمع کرے گا اور ہر ایک کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دے گا۔ اس انعام اور سزا پانے کی جگہ جنت اور جہنم ہے۔

اس تصور کا نام آخرت ہے۔ موجودہ دنیا ہماری زندگی کا آغاز ہے اور آخرت ہماری زندگی کا انجام ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے مستقبل کے بارہ میں ہم کو آگاہ کیا ہے۔ یہ مستقبل کی دنیا ہماری نگاہوں سے اوجھل رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ ہماری حالتِ امتحان میں ہونے کی حیثیت اسی کا تقاضہ کرتی تھی۔ مگر امتحان کی مدت پوری ہو جائے گی تو یہ چھپی ہوئی دنیا بالکل اسی طرح ہمارے سامنے آجائے گی جس طرح موجودہ کائنات ہم کو صاف نظر آرہی ہے۔ اس دنیا میں بظاہر ہم کو صرف ایک ہی جگہ نظر آتی ہے۔ مگر کسی چیز کی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہوتی جتنی وہ دکھائی دے رہی ہو۔ سورج کی روشنی بظاہر دیکھنے میں ایک پیلی چمک دار سی چیز ہے۔ مگر حقیقت میں وہ سات رنگوں کا مجموعہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہماری موجودہ زندگی کے اندر ایک اور زندگی چھپی ہوئی ہے۔ جس کو ہم مرنے کے بعد دیکھیں گے، جہاں ہم مرنے کے بعد پہنچا دیئے جائیں گے۔

یہ آخرت محض ایک مابعد الطبیعی نظریہ نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان خدا کے خوف سے بے پرواہو جاتا ہے تو پھر کوئی چیز نہیں ہوتی جو اس کو دوسروں کے اوپر ظلم کرنے اور دوسروں کو لوٹنے سے روک سکے۔ جن لوگوں نے صرف قانون اور سیاست کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کی ہے۔ ان کی کوششوں نے صرف لوٹ کھسوٹ کی شکلوں کو بدلا ہے۔ اصل صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدانہیں کی ہے۔ حقیقی اصلاح صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان کے اندر غلط روی سے بچنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس جذبہ کو پیدا کرنے والی چیز صرف خدا کی باز پرس کا خوف ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ انصاف پسند اور دیانت دار انسان بنانے کے لئے آخرت کا سہارا لیں۔ اس کے سوا کسی اور ذریعہ سے ہم اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آخرت کا تصور ایک فرضی تصور ہے۔ اگر چہ جن دلائل کی بنا پر آخرت کو فرضی قرار دیا جاتا ہے اگر ان کو صحیح مان لیا جائے تو ساری کائنات فرضی قرار پاتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ہمارا اپنا وجود بھی فرضی ہو جاتا ہے۔ لیکن میں اس سے بحث نہیں کروں گا۔ اس کے جواب میں یہاں میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آخرت اگر فرضی چیز ہے تو وہ ہمارے لئے اس قدر ضروری کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح معنوں میں کوئی سماجی نظام بنا ہی نہیں سکتے۔ انسانی ذہنوں سے اس تصور کو نکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لئے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے۔ کیا اس کائنات میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے کہ ایک چیز حقیقت میں موجود نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اس قدر حقیقی بن جائے۔ زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ زندگی سے اتنی متعلق نظر آئے۔ زندگی کی صحیح اور منصفانہ تنظیم کے لئے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخرت اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ اگر چہ ہماری آنکھوں سے ہم کو نظر نہیں آتی مگر اس کے باوجود وہ نظر آنے والی تمام چیزوں سے زیادہ واضح اور یقینی ہے۔ کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ بقید ہوش وحواس اس کا انکار کر سکے۔

تیسری چیز جو خدا کے رسول نے بتائی وہ اس سوال کا جواب ہے کہ انسان خدا کے ساتھ تعلق

جوڑنے کے لئے کیا کرے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس کو تین عنوانات کے تحت جمع کیا جاسکتا ہے۔ ذکر، عبادت، قربانی۔ ذکر سے مراد یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو ہر آن ذہن میں تازہ رکھا جائے اور خدا کو اس کی تمام حیثیتوں کے ساتھ اس طرح یاد کیا جاتا رہے جس طرح رسول نے یاد کرنے کے لئے بتایا ہے۔ عبادت سے مراد وہ مخصوص بدنی افعال ہیں جو شریعت میں اس لئے مقرر کئے گئے ہیں تا کہ انسان کی مادی حیثیت پر اس کی روحانی حیثیت کو غالب کیا جائے اور اس سے ایسے اعمال کرائے جائیں جو نفسیاتی طور پر اس کو خدا سے قریب کرنے والے ہوں۔ قربانی اپنے جذبات اور اپنے اثاثے کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا نام ہے۔ انسان جب اپنی محبوب چیزوں کو خدا کے نام پر قربان کرتا ہے تو گویا وہ اپنے احساسات کو خدا کے تابع کرتا ہے اور اپنی دلچسپیوں کو آخری حد تک خدا کی طرف موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح یہ قربانی آدمی کو اس کے رب سے بالکل قریب کر دیتی ہے۔ یہ ذکر و عبادت اور قربانی ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ انسان کی طرف سے اپنے رب کے لئے انتہائی تعلق کا اظہار ہے۔ بندہ جب اپنے محبوب آقا کو اپنے دل اور اپنی زبان سے یاد کرتا ہے تو اس کو ہم ذکر کہتے ہیں، جب وہ جذبات سے بے خود ہو کر اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیتا ہے تو اس کا نام عبادت ہے اور جب وہ اپنی ساری متاعِ حیات کو خدا کے لئے لٹا دیتا ہے تو یہی قربانی ہے۔ رسول ان چیزوں کا طریقہ بتاتا ہے اور اس کے لئے آدمی کو تیار کرتا ہے۔

چوتھی چیز انسان کا انفرادی اخلاق اور اس کا اجتماعی قانون ہے۔ اس سلسلے میں نہایت تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک فرض شناس اور حق پسند زندگی کے لئے جن صحیح ترین اصولوں کی ضرورت ہے وہ سب نہایت وضاحت سے بتا دیئے گئے ہیں۔ لیکن صرف انفرادی وعظ سے کسی سماج کے اندر عمومی اصلاح نہیں ہو سکتی اور نہ یہی ممکن ہے کہ اصلاح یافتہ اشخاص دیر تک اپنے رویے پر باقی رہ سکیں۔ اس لئے ہمہ گیر نوعیت کا سماجی قانون بھی ہمارے حوالے کیا گیا ہے تا کہ اس کی بنیاد پر ایک اسٹیٹ بنائی جائے اور سماجی پیمانے پر خدا کی مرضی قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام

صرف ایک شخص یا چند اشخاص کو خدا پرست دیکھنے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ پوری نوع انسانی میں ایک ایسا انقلاب لانا چاہتا ہے جس سے شخصی اور اجتماعی زندگی کے تمام تضادات ختم ہو جائیں اور سارے انسان مل کر خدا کی فرماں برداری کرنے لگیں۔

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو تمام مذاہب میں صرف اسلام کو حاصل ہے۔ جہاں تک خدا اور اس سے متعلق دوسرے مابعد الطبیعی تصوارت کا معاملہ ہے وہ دوسرے مذاہب میں بھی کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا کسی مذہب کے پاس ایسا کوئی سماجی ڈھانچہ اور قانونی نظام ہے جس کی بنیاد پر اسٹیٹ کی تعمیر کی جا سکے تو اس کے جواب میں اسلام کے سوا کسی اور مذہب کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ اسلام کے پاس وہ بنیادی قوانین بھی صحیح شکل میں محفوظ ہیں جو خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے تھے اور ان قوانین کی بنیاد پر جو سماجی نظام بنایا گیا تھا اس کا ریکارڈ بھی تاریخ میں موجود ہے۔ یہ خدا کی ایک ایسی نعمت ہے جس کو اگر اختیار کر لیا جائے تو وہ تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں جو آج انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں۔

اس کائنات کا ایک خدا ہے جو اُس کا خالق و مالک ہے۔ خدا نے ایک خاص اسکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے۔ اپنی اس اسکیم کا علم وہ اپنے ان منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے، جن کو ہم رسول کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپ کی پیروی کرنی ہے۔ اسی حقیقت کا نام اسلام ہے، اور اسی حقیقت کے تعارف کا نام اسلامی دعوت ہے۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-762-0

9 788178 987620

₹ 20.00